ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

''اداس نسلیں'' برصغیر کی سیاسی عصریت کا مؤثر بیانیہ

Most of the novels dealing with the themes of partition riots are celebrated as a popular literature. Albeit these novels could not get recognition from serious literary circles, However, Abdullah Hussein's novel touches the universal themes of widespread upheavals of the partition era, post colonial trauma in the region, break up or rejuvenation of human relations, illuminating the freedom from colonial rule or class struggle against the capitalism. This novel is full of intellectual engagement with the issues of alienation, nostalgia, historical consciousness etc.

Novelist tracks the pre history of partition in order to get familiar with the tragic agony of his contemporary society. Reader cannot deny the superb craftsmanship of the novelist with which he paints not only the social and political background of the partition riots but also endeavors to capture the actual political, social, financial, moral and cultural scenario under the British Empire.

فسادات کو موضوع بنانے والے ناولوں میں اکثر کا شمار معروف یا مقبول عام ادب میں ہوتا ہے۔ مثلاً اور انسان مر گیا از راما نند ساگر، رقص ابلیس از ایم اسلم، ۱۵ / اگست از رشید اختر ندوی وغیرہ۔ گو کہ ان ناولوں کا اور'' خاک اور خون'' از نسیم حجازی کا خالص موضوع فسادات اور ان سے پیدا ہونے والا انسانی المیہ ہے البتہ ان ناولوں کو قبولیت عام اور ادب عالیہ کی سند نہ مل سکی۔ ان ناولوں میں واقعات کا عقلی وفکری تجزیہ کرنے کے بجائے جذباتی نقطہ نظر کو اہمیت دی گئی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم کا خیال ہے کہ ان ناولوں میں انسان کی اصل سرشت جو کہ حیوانی ہے، کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> فسادات کے ان ناولوں میں جابجا اخلاقی درس اور اصلاحی اشارے بھی ہیں۔ انسانیت کی بلند قدروں کی منور کرنیں بھی کہیں کہیں جھلکتی اور چمکتی ہیں، اور بلاشبہ کہیں کہیں فن کی لطافت بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے فسادات کے یہ سب ناول، ناول کے فن کے حد درجہ جذباتی اور اس لیے انتہائی کم زور اور غیر فنی نقوش ہیں۔ ان سب ناولوں میں (جستہ جستہ اور منتشر اجزا کو چھوڑ کر) فن نے ترقی کے بجائے تنزل اور انحطاط کی اقدار کو زندہ کیا ہے۔ اس کی وجہ جذباتی ہیجان، اور شدت سے قطع نظر جو اس موضوع

کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے، یہ ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے یہ ناول لکھتے وقت فن کے مطالبات کا خیال رکھنے کے بجائے قاری کے ہنگامی تاثرات کی شدت کی ہم نوائی کی ہے۔[1]

یہ تمام ناول زندگی کے پھیلاؤ، اس کی فکری جہات، مسائل زندگی کی سنجیدہ ترجمانی، انسانی المیہ اور خود ناول کی فنی و فکری جہات سے تہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان ناولوں کو زیادہ پذیرائی نہ ملی۔ تقسیم کے تاریخی عوامل، برصغیر کی غلامانہ زندگی، سامراج کی چیرہ دستیوں، انسانی تعلقات میں بداعتمادی کی فضا اور اس کے نتیجے میں سامراج کے مفادات کا تحفظ، بعد ازاں تقسیم، فسادات اور ہجرت کو ''اداس نسلیں'' میں عبداللہ حسین نے سنجیدہ انسانی تاریخ کے حوالے سے موضوع بنایا ہے۔ ناول کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوتا ہے لیکن مصنف سامراج کے استبداد کی حقیقی عکاسی میں ناکام رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سامراج اور نو آبادیاتی باشندوں کے مابین بنتی ہوئی نئی طبقاتی درجہ بندی کا ادراک نہیں کر سکا۔ ''اداس نسلیں'' کے زمانی پھیلاؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے مدیران ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' رقم طراز ہیں:

> دور سرسید سے شروع ہونے والا یہ ناول مختلف سیاسی واقعات سے گزرتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ، آزادی کی تحریک، دوسری عالمی جنگ سے گزرتا ہوا تقسیم ملک کے چند سال بعد تک کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ جنگ کے واقعات و مناظر کے بیان بڑے مؤثر ہیں۔۔۔ عبداللہ حسین کے ہاں اپنے کرداروں کی بے حسی اور سرد مہری کو اہتمام کے ساتھ پیش کرنے کا رجحان بہت نمایاں ہے۔ اس ناول کا بنیادی کردار نعیم ہے جس کے ذریعے تمام واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔[2]

عبداللہ حسین نے عالمی جنگ کے واقعات اور مابعد کی صورتحال کی عکاسی میں زیادہ بہتر عصری شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ عصری شعور اپنے عصر کی مکمل انسانی صورتحال سے آگاہی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ ناول کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوتا ہے لیکن یہاں مغلیہ حکومت یا اس کی باقیات کا تذکرہ نہیں ہے۔ اسی طرح برطانوی عہد کے ہندوستانی سماج کی عکاسی میں بھی مصنف زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی اور معاشی بحران اور اس کے اثرات بھی مفصل نہیں ہیں۔ البتہ ناول نگار نے ناول کے تین حصوں میں انسانی المیے کی تاریخیت کی موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا آخری حصہ جو ہجرت اور فسادات پر مشتمل ہے، زیادہ مؤثر ہے۔ رضی عابدی شاید اسی حصے کے انسانی المیے کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عبداللہ حسین نے اس ناول میں اپنی نسل کی مایوسیوں اور محرومیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ نسل جس نے ایک ملک ٹوٹتے ہوئے اور ایک معاشرہ کو بکھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جہاں تمام انسانی قدریں مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ انسانوں نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ لاکھوں بے گھر ہوئے، لاکھوں مارے گئے۔ اس تمام افراتفری کے پیچھے ایک بری طرح الجھی ہوئی سیاسی، معاشرتی اور نظریاتی صورتحال تھی، عبداللہ حسین نے اس صورتحال کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔[3]

اپنی ہم عصر نسل کا المیہ جاننے کے لیے ناول نگار اس عہد تک کی تاریخ میں سفر کرتا ہے جب برصغیر پر انگریز سامراج کا مکمل غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصنف نے کوشش کی ہے کہ نہ صرف تقسیم اور فسادات کا سیاسی و سماجی پس منظر بیان کیا جائے بلکہ ہندوستان کے سامراجیت کے شکار ہو جانے کے بعد کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، تمدنی اور اقتصادی صورتحال کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے۔ سامراج کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو وہ ظلم و ستم پر آمادہ ہو گیا۔ سانحہ جلیانوالہ باغ ہندوستان کے نفسیاتی اذہان کی شکست و ریخت کا باعث بنا۔ احساس ذلت نے تحریک آزادی کو شدید تر کر دیا۔ جنگ عظیم نے عام دیہاتی محنت کش اور کسان کو ایک نئے المیے سے دو چار کر دیا تھا۔ کیونکہ اسے اجنبی سرزمین پر اجنبی لوگوں کے دفاع میں بطور ایندھن استعمال کیا گیا۔ ناول میں دیہاتی و شہری تمدن، جاگیر دارانہ نظام کی استحصالی لوٹ کھسوٹ، نوآبادیاتی نظام اور اس کے اثرات، سامراج اور ان کے کاسہ لیس جاگیرداروں اور شہری تمدن میں سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ، ہندوستان کی سیاسی بیداری، ہندمسلم ثقافتی تاریخ، پنجاب بالخصوص سکھ معاشرے کا انتشار، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے مسائل اس ناول کا موضوع بنے ہیں البتہ زمانی وسعت، موضوعاتی تنوع اور اسلوبیاتی روانی کے باوجود اور دستاویزی استدلال کے باوصف فنی اعتبار سے زیادہ کامیاب ناول نہیں بن سکا۔ مصنف ناول کے ہیرو نعیم کو مختلف مقامات پہ لے جاتا ہے اور قصہ از خود ان مقامات کو پیش کرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں تین مختلف قصے موجود تھے جنھیں وہ ایک ناول میں لانے کا خواہش مند تھا چنانچہ ان قصوں میں پیش کی جانے والی زندگی تخلیقی ربط کی اعلیٰ سطح تک نہیں پہنچ پائی۔ البتہ ناول اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے قطع نظر اس امر کے کہ یہ مسائل قصہ کا تخلیقی حصہ کس حد تک بن سکے ہیں۔ ناول شہری تمدن، نئے ابھرتے سرمایہ دارانہ نظام، صنعتی مزدوروں کے مسائل، ہڑتالیں، حکومتی جبر، جیل کی مکروہ فضا اور اعلیٰ طبقات کی فراغت اور ان کے مشاغل کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ گویا ناول نگار کے ذہن میں موضوعات کا ہجوم ہے اور وہ اپنے ہیرو کے ذریعے ہر موضوع کی عکس بندی کرنا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ ناول نگار مغربی تمدن کا نظارہ بھی کرا دیتا ہے اور اس کی ایک تقابلی فضا بھی نظر آنے لگتی ہے کہ حاکم اور محکوم اقوام کے درمیان جو تفریق ہے وہ کیا نتائج مرتب کر سکتی ہے۔ عبداللہ حسین اس امر سے آگاہ ہیں کہ سیاسی شعور افراد معاشرہ میں اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ اپنی تاریخ سے آگاہ ہوں گے۔ اسی لیے برصغیر پہ سامراج کے مکمل غلبے کے بعد نوآبادیات نے یہاں کے سماج کو ان کی اصل تاریخ سے بے بہرہ رکھا اور انھیں جو نیا تاریخی شعور نصاب کے ذریعے دیا گیا وہ یہی تھا کہ یہاں کا سماج اجڈ، وحشی اور غیر مہذب تھا، برصغیر کی تاریخ صرف سفاکی اور ظلم پر مبنی تھی جبکہ انگریز سرکار نے یہاں تہذیب و تمدن کے پھول کھلائے ہیں۔ انگریز سامراج کا حمائیتی جاگیردار بھی اسی تاریخ کو اپناتا دکھائی دیتا ہے جو نو آبادیات اسے ازبر کراتا ہے۔ گویا اگر اقوام کے تاریخی تصورات بدل دیئے جائیں تو ان کے سیاسی شعور میں بدلاؤ ممکن ہے اور انھیں آسانی سے غلام رکھا جا سکتا ہے:

> ''تاریخ کا مطالعہ سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے از حد ضروری ہے''۔ ڈاکٹر امبیدکر، جن کی جاگیریں اودھ کے علاقے میں تھیں، منہ میں پائپ ڈالے ڈالے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سفید فام شخص سے کہہ رہے تھے۔
> ''ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جب قومیں تاریخ کے علم کی کمی کی وجہ سے سیاسی جدوجہد ہار گئیں۔

میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے عوام کو جو نوے فیصد نا خواندہ ہیں، کیسے سیاسی تعلیم دی جا سکتی ہے؟ عظیم انقلاب فرانس یا حال کی بات کریں تو روسی انقلاب جو رونما ہوا تو مختلف حالات اور تاریخی پس منظر اور قطعی مختلف قسم کے عنصر کے ہاتھوں۔''

''عوام دانشوروں کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار ہیں۔'' سفید فام نے Quote کیا۔[۴]

گویا دونوں کردار یہ امر بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ سیاسی شعور بہرحال تاریخ میں سفر کرنے سے حاصل ہو گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ برصغیر کے عوام کو نا خواندہ ہی رکھا جائے۔

''اداس نسلیں'' میں زندگی کے تین ادوار کی عکاسی کی گئی ہے۔ پہلا دور برطانوی سامراج کے غلبے سے آغاز ہوتا ہے اور پھر بیسویں صدی میں اس غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے جبر کے ہر ہتھکنڈے کو استعمال کرتا ہے۔ دوسرا دور اسی جبر کی کوکھ سے تحریک آزادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو آزادی کی صبح تک آتا ہے لیکن یہ آزادی ایک ایسے تیسرے دور کو جنم دیتی ہے جہاں فسادات ہیں، تقسیم کا المیہ ہے، انسان درندگی پر اتر آیا ہے اور وہ اپنوں اور غیروں کا امتیاز بھی ختم کر چکا ہے۔ اس انسانی آشوب پہ، جس نے نسلوں کو اداس کرنا تھا مگر فقط ''نعیم'' (ناول کا ہیرو) کو ہی اداس کر سکا، ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں:

> عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' (۱۹۶۳ء) بھی جدوجہد آزادی اور تقسیم ہند کے عمل کے حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے پس منظر میں لکھے جانے والے اجتماعی ناولوں کی روایت کی ہی ایک اگلی کڑی شمار ہوتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اس لیے تھوڑا سا مختلف ہے کہ اس نے کلچر اور ثقافت کے سیاق و سباق میں تقسیم کے عمل کو انسانی احساسات اور انسانی جذبوں کی تقسیم کی شکل میں نہیں دیکھا۔ ویسے بھی اس ناول میں ''بنیادی آشوب'' فرد کے دائرے سے نکل کر انسانی سطح تک پہنچ ہی نہیں سکا۔ یہی اس ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔[۵]

ناول بالخصوص پہلی جنگ عظیم کی جبری بھرتیوں اور نوجوانوں کی مختلف ممالک کی سیاحت، چاہے وہ جنگ کی خاطر ہی کیوں نہ ہو، نے ان میں دیگر اقوام کی آزادی کے اثرات بیدار کر دیے سو انھیں اپنے وطن کی غلامی، جبر کی فضا، سیاسی و سماجی استحصال کا شعور حاصل ہوا۔ جنگ سے واپسی پر یہ افراد آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوتے ہیں لیکن مصنف ان کی سیاسی بیداری کو پوری طرح احاطہ تحریر میں نہیں لا سکا۔ البتہ مشرقی پنجاب میں اس سیاسی بیداری اور دیہی زندگی پر اس کے اثرات کو ناول نگار نے زیادہ بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔

''اداس نسلیں'' برطانوی سامراجیت، استحصال، نظام جبر اور مقامی جاگیردار کا غیر ملکی آقاؤں کی حمایت، مقامی کسانوں پر ظلم وستم کے اچھے مرقعے پیش کرتا ہے۔ کسانوں کی مفلوک الحالی، محنت کے باوجود بے ثمر رہنے کی کیفیت، بے بسی اور بے چارگی جہاں بھی ناول کا موضوع بنے ہیں، عبداللہ حسین کی جزئیات نگاری نے ماجرے کو تجسس آمیز اور اپنے عصر سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

عبداللہ حسین نے پریم چند کے بعد اردو ناول میں پہلی بار ہندوستان کے کسان کی روح کی اداسی، زندگی کی یکسانیت اور بے مصرف محنت کو موضوع بنایا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں، جاگیرداروں کے استحصال، مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ اور قدرتی آفات نے اس کسان کو اتنا بے حس و بیکس بنا دیا ہے کہ اس کی زندگی میں خوشی یا سکون نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ وہ محنت کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے اور محنت کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے یہ محنت نہ اس کے معیار زندگی کو بلند کرتی ہے اور نہ اس کے سماجی رتبے میں کوئی اضافہ کرتی ہے کیونکہ اس کی محنت کے پھل برطانوی جبر واستبداد کے زیر سایہ پل رہے روشن آغا جیسے PARASITES لے جاتے ہیں۔[۶]

گویا مصنف کا سماجی شعور اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے کہ صدیوں کے سفر میں ہندوستان کے غریب کسان کی زندگی میں بدلاؤ نہیں آیا۔ وہ محنت کرتا ہے مگر ثمر سے محروم رہتا ہے جبکہ تاریخ کے ہر دور اہے پر ایسا استحصالی نظام موجود رہا ہے جو کسان کی محنت لوٹ لے جاتا ہے۔ یعنی نظام میں ایسی جوہری تبدیلی اب ناممکنات میں سے ہوگئی ہے جو برصغیر کے کسانوں کی زندگی سے اداسی، مایوسی اور لاچارگی کو ختم کر دے۔ کسان نے بھی تاریخ کی تہہ در تہہ چیرہ دستیوں کو مقدر کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ناول کے بیشتر کردار جب نئے ملک پاکستان پہنچتے ہیں تو انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ جس معاشی خوش حالی کا خواب لے کر آئے تھے وہ تو یہاں بھی سراب ہے۔ معاشی خوش حالی عملاً دستیاب نہ ہونے پر ''آگ کا دریا'' کے کردار ہوں یا ''آنگن'' کا آدرشی صفدر یا ''اداس نسلیں'' کے کردار سب اس نظام ہوس کا بالآخر حصہ بن جاتے ہیں، جو استحصال پر قائم ہے۔ اس طرح یہ تمام کردار اپنے معاشی مسائل حل کر لیتے ہیں۔ ''اداس نسلیں'' جس سماجی و معاشی مساوات پر زور دیتا ہے اور ہندوستان کے غریب کسان مزدور کی زندگی کو برصغیر کے مخصوص تاریخی ادوار میں دیکھتا ہے اس کا شائبہ بھی جب آزادی کے بعد دکھائی نہیں دیتا ہے تو اداسی آئندہ نسلوں کا بھی المیہ بن جاتی ہے۔ گو کہ ناول کا ہیرو نعیم پاکستان نہیں پہنچ سکتا مگر اس کی نسل کے لوگ پاکستان آ جاتے ہیں اور ان کے سوالات وہی ہیں جن سے نعیم دوچار تھا۔ البتہ ان کی تعبیر پاکستان میں بھی میسر نہیں ۔ بلکہ بقول محمد عاصم بٹ:

> نعیم کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال اصل میں ایک پوری نسل کے سوالات ہیں۔ خاص طور پر وہ نسل جو ہجرت کر کے پاکستان آئی اور اس نے دیکھا کہ جس جاگیردارانہ نظام اور جبر و استبداد سے وہ یہ سب کچھ ہو جانے سے پہلے پریشان تھے، وہ زہر اب بھی فضا میں موجود ہے اور انھیں سرحد کے اس طرف آ کر اسی نظام کا سامنا ہے۔ نعیم کو پاکستان میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا لیکن اس کے سوالات نئے ملک میں آنے والی نسل اپنے ساتھ لائی ہے۔[۷]

''اداس نسلیں'' میں برتے گئے علامتی ناموں سے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ ناول میں پیش کی گئی تین نسلوں کی کہانی اپنے اپنے عصر میں اداسی و بے بسی کے شکار لوگوں کا ماجرا ہے۔ البتہ سہیل بخاری جو ''اداس نسلیں'' کو بجا طور پر ''سیاحتی ناول'' قرار دیتے ہیں، کا کہنا ہے کہ نعیم کا کردار ان نسلوں کا نمائندہ نہیں بن سکا کیونکہ کسی ایک کردار کے

وجودی مسئلے سے ساری نسل کی نمائندگی نہیں ہو پائی یا مصنف ایسا ثابت کرنہیں پائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> عبداللہ حسین نے اس پیش کش کے ذریعے نسلوں کی اداسی ثابت کرنا چاہی تھی لیکن ثابت نہیں کر سکے۔ ایک معمولی کاشت کار کے بیٹے کو جو مجرم ضمیر کے ساتھ زمیندار کی لڑکی سے شادی کر کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے مفلوج ہو کر زیادہ حساس بن جاتا ہے اور آخر میں بالکل پاگلوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہے اگر (اسے) دنیا اداس نظر آئے تو کوئی تعجب نہیں لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ پوری کی پوری نسلیں اداس ہیں کیونکہ ایک ذہنی و جسمانی مریض کو کسی نسل انسانی کی نمائندگی کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ دوسرے کرداروں کے طرز عمل سے بھی اس اداسی کا سراغ نہیں ملتا جو اس کتاب کے سرکا تاج بنائی گئی ہے اور جسے ثابت کرنے کے لیے مصنف کتاب کے آخری حصے میں کہانی کو چھوڑ چھاڑ کر محض بحثوں اور تقریروں پر اتر آئے ہیں۔[۸]

درج بالا اقتباس میں مصنف کی دیگر باتوں سے اتفاق کے علاوہ آخری سطور میں کی گئی نشاندہی کہ ناول نگار بحث مباحثے اور پندونصائح کا پٹارہ کھول لیتے ہیں، اردو ناول کا اصل المیہ ہے۔یعنی اردو ناول نگار فکری مباحث کو ماجرے کا حصہ بنا کر پیش نہیں کرتے یعنی فکری مباحث ماجرے میں آمیخت ہو کر نہیں آتے بلکہ مصنف الگ سے انھیں تحریر میں لاتا ہے۔چنانچہ ناول ''اداس نسلیں'' کے بھی مختلف مناظر باہم یک جان نہیں ہو سکے۔ اسی لیے ناول کی اکائی دریافت کرنا مشکل امر ہے۔ سہیل بخاری کا یہ کہنا بجا ہے کہ ناول کا مرکزی کردار نعیم اپنی نسل کا نمائندہ نہیں بن سکا۔ دراصل اس کردار کی داخلی ثنویت اسے کسی اکائی یا وحدت تاثر تک نہیں لے جاتی۔ نعیم ہندوستانی طبقاتی سماج کا ایسا مجہول کردار ہے جو اپنی طبقاتی حیثیت دریافت نہیں کر سکا۔ دیہاتی ماحول کا فرد سینیئر کیمرج کرنے کے بعد محض ایک خواہش کی تکمیل کے لیے لانس نائیک بھرتی ہونے کو ترجیح دیتا ہے حالانکہ وہ قوم پرست بھی ہے۔ یہ ناول کے داخلی تضادات ہیں۔نعیم آزادی پسند ہے اور جاگیر دارانہ استحصال کے خلاف بھی ہے لیکن جاگیر دار خاندان سے تعلق بنانے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ رضی عابدی بھی نعیم کو نمائندہ کردار نہیں سمجھتے۔ وہ لکھتے ہیں:

> نعیم کسی طرح بھی اپنی نسل کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو ایک تنہا انسان ہے اس کی محرومیاں اس کی ذاتی محرومیاں ہیں۔ ان کا اس کسی نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں کوئی اداس نسل نہیں ہے بلکہ اداس افراد ہیں جن کی اداسی کی وجوہات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ نہ ان کی الجھنیں مشترکہ ہیں نہ مسائل۔ نہ ہی وہ کسی مشترکہ سوچ کی تلاش میں ہیں اور اس کا گاؤں بھی دلی اور پنجاب کی سرحد پر کسی جگہ واقع ہے یعنی اس کے مقام کا بھی کوئی تعین نہیں ہے۔ وہ اپنی اصل سے اکھڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے کبھی اپنی اصل کا کوئی شعور نہیں ہوا۔[۹]

اردو ناول نگاری میں دوران ہجرت پیش آنے والے واقعات کو کسی بڑے ناول نگار نے سوائے عبداللہ حسین کے موضوع نہیں بنایا۔ مثلاً قرۃالعین حیدر ہجرت کا المیہ گہرے ثقافتی کرب کے ساتھ بیان کرتی ہیں مگر ان کے کردار قافلوں

کے ساتھ سفر کرنے کے بجائے ہوائی جہازوں کے ذریعے اپنے نئے مقام اور مرتبے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح خدیجہ مستور کے کردار بھی اچانک لاہور نمودار ہو جاتے ہیں اور نسبتاً آسان زندگی یہاں بھی ان کی منتظر ہوتی ہے۔ ''زمین'' ناول میں خدیجہ مستور نے مہاجرین کیمپ کا احوال لکھنا چاہا ہے مگر ان کی جذباتی وابستگی ان واقعات میں استدلالی قوت پیدا نہیں کر سکی۔ قافلوں میں سفر، لوٹ مار، بھوک پیاس کی شدت، کمزور طبقات مثلاً بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی اموات خواتین کی بے حرمتی جیسے موضوعات البتہ اردو افسانے کا خوب موضوع بنے ہیں۔ مثلاً مہاجرین کیمپ کی روداد لکھتے ہوئے خدیجہ مستور ناول ''زمین'' میں منٹو کے افسانے ''کھول دو'' جتنی حقیقت نگاری بھی نہیں دکھا سکی ہیں۔

عبداللہ حسین نے جہاں اپنے عصر کے سیاسی انتشار کو موضوع بنایا ہے وہیں سیاست کی چیرہ دستیوں اور اس کے نتیجے میں تقسیم کے عمل کے دوران فسادات کو بھی کامیابی سے موضوع بنایا ہے۔ فرقہ پرست عناصر نے ساری فضا کو مسموم بنا دیا تھا۔ ہندوستان تاریخ کے ایسے دوراہے پر آ گیا جہاں اس کے سامنے منزل کے نقوش دھندلا گئے تھے۔ اس سیاسی بحران کو عبداللہ حسین نے یوں پیش کیا ہے:

> پارلیمنٹ میں عجیب گہما گہمی تھی۔ ہند کی مکمل آزادی کے لیے آخری گفت و شنید ہو رہی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پارلیمنٹ میں گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرنسیں بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر سے سول نافرمانی کی خبریں موصول ہوتی رہتی تھیں۔ ملک کی دونوں پارٹیوں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی جمع تھے اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ملک کے مستقبل کے متعلق ہر کوئی اپنی سی پیشین گوئی کر رہا تھا لیکن ہر کوئی اپنی جگہ مکمل بے یقینی اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔ روزانہ زندگی کا ہر کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ ملک کے بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اور لوگ ایک جاں گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔ چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ دور تھا کہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔[10]

''اداس نسلیں'' اپنے عصر کی سیاسی و سماجی جہات کو محیط ہے۔ البتہ دوسری جنگ عظیم اور اس کے اثرات ناول کا حصہ نہیں بن سکے۔ ناول نگار نے بعض سوالات کے تشنہ رہ جانے کے خیال سے جو نظریاتی، سیاسی اور مذہبی مباحث چھیڑے ہیں ان کا معیار سطحی ہونے کے علاوہ ماجرے سے کوئی ربط نہیں بنا سکا۔ شاید اسی لیے رضی عابدی نے اسے ''صحافتی واقعہ نگاری'' قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ادیب سے مصلحانہ یا ناصحانہ پیغام کا مطالبہ ادبی رویہ کی نفی ہے۔ لیکن ادیب سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ زندگی کے تضادات اور اس کے گنجلک مسائل جس قسم کی نفسیات کو پیدا کر رہے ہیں ان کی نوعیت اور خدوخال کو شعوری سطح پر لا کر ٹھوس شکل میں تخلیق کرے۔۔۔ ''اداس نسلیں'' فکری اور فنی دونوں اعتبار سے غیر تسلی بخش ہے۔۔۔ ''اداس نسلیں'' مختلف، باہمی بے ربط تصویروں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے جسے مرقع نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں ایک قسم کی صحافتی واقعہ نگاری ہے جو فن کے تخلیقی تقاضوں پر پوری نہیں اترتی۔[11]

''اداس نسلیں'' اردو کے اہم ناولوں میں ایک ایسا ناول ہے جس میں مصنف نے ہجرت کرنے والے قافلے کی جامع تصویر کشی کی ہے۔ دوران ہجرت کئی خاندان بچھڑ گئے، لاکھوں انسان تباہ حال ہو گئے۔ ناول کے بہت سے کردار دیگر ناولوں کے کرداروں کی طرح ہوائی سفر کر کے اپنے نئے مستقر پہ آ گئے مگر'' اداس نسلیں'' کا نعیم ایک قافلے میں شامل ہوا۔ یہاں مصنف نے قافلے کی صورتحال کی عکاسی خوب کی ہے۔تقسیم کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں عبداللہ حسین کا اختصاص بھی یہی ہے کہ انھوں نے بے خانماں آباد لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی میں غیر جانبداری کا رویہ برقرار رکھا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے ہجرت کرنے والے قافلے کے متعلق عبداللہ حسین کے نقطہ نظر کو غیر جانبدارانہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اداس نسلیں'' میں عبداللہ حسین نے پاکستان اور ہندوستان سے بچھڑے ہوئے لاکھوں انسانوں کے بے ترتیب، پریشان اور تباہ حال قافلوں کی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ یہ تصویریں جذباتی عصبیت سے پاک ہیں۔ ناول نگار نے دونوں فرقوں سے غیر جانبداری کا رویہ برتتے ہوئے خالص انسانی نقطۂ نگاہ کے تحت حالات کا جائزہ لیا ہے اور حقائق کے احتساب پر خاص زور دیا ہے۔ اس لحاظ سے ''اداس نسلیں''، تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا ہوا ایک عمدہ ناول ہے جس میں فسادات کی صورت میں انسانیت کی موت اور تہذیبی قدروں کی شکست کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔[۱۲]

تقسیم برصغیر نے بالخصوص پنجاب کے طول وعرض میں ہولناک فسادات کو جنم دیا۔''اداس نسلیں'' کے روشن پیلس کے مکینوں کو بھی نئے وطن پاکستان ہجرت کرنا پڑتی ہے لیکن ان کا تعلق اشرافیہ سے ہے اور اسی طبقہ سے ہے جسے یہاں آ کر بھی حکومت سنبھالنی ہے۔ اس لیے یہ تمام افراد ہوائی جہازوں کے ذریعے لاہور پہنچ جاتے ہیں البتہ نعیم یہاں بھی اپنی شخصیت کے فطری تذبذب کے طفیل پہلے تو پاکستان نہ جانے کا فیصلہ کرتا ہے بعد ازاں پیدل جانے والے قافلے میں شامل ہو جاتا ہے۔قطع نظر اس امر کے کہ مصنف نعیم کے اس فیصلے کی کوئی وضاحت پیش نہیں کرتا حالانکہ اب وہ زندگی کی سہولتوں کا عادی ہو چکا ہے اور بڑھاپے کی طرف مائل بھی ہے اور مصنف اس امر سے بھی آگاہ ہے کہ وہ ہجرت میں راستے کے مصائب نہیں جھیل سکتا اور وہ منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل ہی نیم پاگل ہو جاتا ہے اور اسے بالآخر بلوائیوں کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ البتہ ہجرت کرنے والے اس قافلے کی عکاسی مصنف نے زیادہ حقیقی اور بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ اردو ناول میں عبداللہ حسین سے قبل اور مابعد بھی تقسیم کو تو موضوع بنایا جاتا رہا ہے لیکن دوران ہجرت انسانوں پر کیا بپتا پڑی، اس کا بیان شاذ ہی ملتا ہے۔''اداس نسلیں'' کا یہ اختصاص ہے کہ ناول کا معتدبہ حصہ ہجرت کرنے والے قافلے کے حالات پر مشتمل ہے۔ ہجرت کی پیش کش اور انسانی المیے کے بیان کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> اس مہاجر قافلے کا ذکر ناول میں تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور ان صفحات میں اس قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی ونفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں اور جان و مال کے نقصان کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے

والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی۔[۱۳]

مصنف کو اس امر کا ادراک ہے کہ حکومت وقت نے بعض فیصلے نہایت عجلت میں کیے اور مزید یہ کہ آزادی اور بٹوارے کے عمل کے دوران کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ تبادلہ آبادی کا سانحہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ حکومتی نا اہلی نے غیر یقینی کو جنم دیا اور اس غیر یقینی نے ایک بڑے انسانی المیے کو جنم دیا۔ غیر یقینی کی صورتحال کی عکاسی عبداللہ حسین یوں کرتے ہیں:

> چند روز کے بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے۔ ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلوں کے قافلے پیدل چل پڑے۔ ملک کے تمام حصوں سے فسادات اور لوگوں کے بھاگنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ گو ابھی تک سیاسی گفت وشنید کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن ملک کے بٹوارے کے متعلق ایک عام یقین پھیل رہا تھا۔ وہ جسے اب تک ملک کی عام آبادی نے محض خیال آرائی سمجھ رکھا تھا حقیقت بنتی ہوئی نظر آئی تو لوگ دفعتاً خالی الذہن ہو گئے۔ فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ چھاڑ، منزل کا تعین کئے بغیر بھاگ اٹھے۔[۱۴]

نعیم اس قافلے کا ہمراہی ہے اس لیے مصنف نے قافلے میں موجود سراسیمگی، خوف، ڈر کی فضا کا نہایت حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے۔ سامان سفر سے تہی اور مسلسل پیدل مسافت سے بہت سے ناتواں، بوڑھے، کمزور، بچے اور عورتیں راستے میں ہی مرنے لگے یا بلوائی انھیں شکار کر لیتے اور عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ چاروں طرف گھر جل رہے تھے، قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ انسان نے وحشی کا بدن بدل لیا تھا۔ کسی کو منزل کا تعین نہیں تھا۔ بس اک خوف انھیں گھروں سے نکال لایا اور وہ صدیوں کے استحصالی نظام کا خاتمہ سمجھ کر نا معلوم نئی منزل کی سمت گامزن ہو گئے۔ یہ قافلہ جو دلی سے نکلتے وقت چند نفوس پر مشتمل تھا آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا اور اس بڑھتے قافلے میں خارجی خوف کے علاوہ داخلی خوف بھی تھا جو قافلے کے اندر سے پھیلنے والی افواہیں تخلیق کرتی ہیں۔ جب صورتحال غیر یقینی ہوتی ہے اور منزل کا تعین نہیں ہو پاتا تو افواہیں جنم لیتی ہیں:

> جنھوں نے کبھی تھکے ماندے، بے گھر اور دہشت زدہ لوگوں کے درمیان سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے قافلوں میں سب سے بڑی وبا افواہوں کی ہوتی ہے۔ ایک سے ایک بے بنیاد افواہ منٹوں میں قافلے کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتی جا رہی تھی اور نئی سے نئی پھیلتی تھی، یعنی کسی افواہ کی عمر چند گھنٹے سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔ لوگ اتنے خالی الذہن ہو چکے تھے کہ محض چلتے جاتے اور افواہیں پھیلانے کے سوا لگتا تھا کہ ان کو کوئی کام ہی نہ تھا۔[۱۵]

مصنف اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ قافلہ افواہ سازی کا کام خود انجام دے رہا تھا۔ دراصل جب انسانی ذہن لاچارگی، بے بسی اور خوف کا شکار ہو جائے تو اسے اپنا سایہ بھی ڈرانے لگتا ہے۔ یہی صورتحال قافلے کی بھی تھی۔ یہ بے ہنگم لوگوں کا ابنوہ تھا جو نشان منزل بھی نہیں رکھتے تھے اسی لیے ان کی آس بار بار بندھتی تھی بار بار ٹوٹتی تھی اور یہی امر

افواہ پھیلانے کا باعث بنتا:

> یہ نہیں کہ وہ جان بوجھ کر افواہیں پھیلاتے تھے یا یہ کہ ان کے درمیان کوئی کنبہ افواہیں پھیلانے کے ماہروں کا موجود تھا، بلکہ یوں ہوتا کہ بات چیت کے دوران کسی کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ کسی دوسرے کے سر پر سارے وقتوں کی تھکن، بھوک پیاس اور دہشت بن کر سوار ہو جاتا اور قافلے کی تمام تر بے ترتیبی کے باوجود برقی رو کی طرح آناً فاناً ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل جاتا۔ زیادہ افواہیں دو قسم کی تھیں اور دونوں انتہائی متضاد قسم کی تھیں۔ یا تو وہ انتہائی دہشت پسند تھیں، مثلاً یہ کہ اگلے پڑاؤ پر قافلے پر حملہ ہو گا یا انتہائی پُر امید، کہ اگلے شہر میں حکومت نے ان کے لیے نئے لباس اور تازہ کھانے مہیا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہی دو قسم کی افواہیں بار بار الفاظ کا مختلف جامہ پہن کر لہروں کی طرح آ رہی تھیں اور کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس شدید مضحکہ خیز صورتحال کو محسوس کر سکتا۔[۱۶]

دراصل لوگوں میں موجود خوف کسی دہشت پسند افواہ کا باعث بنتا اور خواہش کسی امید افزا افواہ کا لبادہ اوڑھ لیتی۔ مصنف کا تجزیہ درست ہے کہ ان افواہوں کی حقیقت پر کوئی بھی غور کرنے کو تیار نہ تھا۔ عصری صورتحال کی عکاسی اور انسانی نفسیات کا بہترین اظہار ''اداس نسلیں'' کے اسی حصہ میں ہوا ہے جہاں بٹوارے کے بعد پیدل سفر کرنے والے قافلوں کا احوال رقم کیا گیا ہے۔

خود غرضی، مفاد پرستی اور حرص ایسی بد صفات ہیں کہ انسان انتہائی مشکل حالات میں بھی ان سے بچ نہیں پاتا۔ عبداللہ حسین کا نقطہ نظر غیر جانبدارانہ ہے وہ عصری عکاسی کرتے ہوئے انسانی المیے پر زیادہ نظر رکھتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اپنی پسند یا نا پسند کا اظہار کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو ناقدین نے ''اداس نسلیں'' کے اس حصہ کو جہاں قافلہ میں موجود لوگ اپنی نفسی و نفسانی خواہشات سے مغلوب مسافت طے کر رہے ہیں، موضوع نہیں بنایا۔ قافلے میں انسانی خود غرضی کی ایک نہایت عمدہ عکاسی مصنف نے اس وقت کی جب ایک کمزور نوجوان کی موت ہو جاتی ہے:

> اس رات قافلے میں پہلی موت واقع ہوئی۔ وہ ایک کمزور سا نوجوان تھا جو نمونیے سے مرا تھا۔ اس کی بیماری کا کسی کو پتا نہ چلا کیونکہ وہ اکیلا سفر کر رہا تھا۔ صبح سویرے گاڑی کا سہارا لے کر چلنے والوں نے اسے گاڑی میں مرا ہوا پایا اور کود کر اوپر چڑھ گئے۔ چند ایک تو بیٹھتے ہی اونگھنے لگے، دو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن چونکہ گاڑی لاوارث تھی اس پر سوار ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جنھیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ڈنڈوں پر بیٹھنے لگے۔ نتیجتاً دونوں طرف کے بانس کے ڈنڈے بوجھ کے نیچے ٹوٹ گئے۔ آخر بیل کھینچنے سے معذور ہو کر رک گئے۔ اب پیچھے رہ جانے کا خوف ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور خوفناک جدوجہد کی ابتدا ہوئی۔ طاقت ور اور کمزور کی ازلی، حیوانی رقابت، اس دھکم پیل میں گاڑی کے مالک کی لاش نیچے گر پڑی۔[۱۷]

بالآخر چند زور آور گاڑی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ان کی یہ خود غرضی بلاوجہ نہیں ہے بلکہ تھک کر، بد حال ہو کر قافلے سے پیچھے رہ جانے کا خوف انھیں ذاتی مفاد کا اسیر کر دیتا ہے۔ اس نا گفتہ بہ صورت حال میں بھی انسان طمع، حرص اور ہوس سے دامن نہیں بچا سکتا۔ انسانی نفسیات کی عکاسی مصنف کے پیش نظر ہے اور اسے احساس ہے کہ جہاں خوف کی حکمرانی ہو وہاں اپنی زندگی بچانے کے لیے مزید خوف کی فضا پیدا کی جاتی ہے۔ دلی سے پیدل نکلنے والے قافلے کا ہر پڑاؤ پر حجم بڑھ رہا تھا اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ قافلے والوں کو ہر دم حملے کا خوف تو تھا لیکن اس قافلہ پر کافی مسافت طے کرنے کے بعد ابھی تک حملہ نہیں ہوا تھا۔ حملہ آور اور لوٹ مار کرنے والے گروہ جب قافلے کو آن گھیرتے ہیں تو قافلے پر حملوں اور اس کے بعد کی کیفیت کی مصنف نے نہایت حقیقی عکاسی کی ہے:

> انہیں چلتے ہوئے نو روز ہو چکے تھے۔ اب وہ جالندھر کے قریب پہنچ رہے تھے۔۔۔ قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے اور وہ ایک پل کے لیے بھی بے خبر ہو کر نہ چل سکتے تھے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے۔۔۔ اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے ہر حملے کے مُردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے، روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے، کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نوجوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں۔[۱۸]

ہجرت کرنے والے ان قافلوں میں عورتیں بالعموم زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنیں۔ عورتوں کا استحصال اور ان کی عصمتوں کی پامالی بٹوارے کے سارے عمل میں عروج پر تھی۔ نہ صرف قافلے پر حملہ آور عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے اور ان کی اجتماعی آبرو ریزی کے بعد انھیں مار دیتے یا جنگلوں میں بے آسرا چھوڑ دیتے بلکہ خود قافلے میں موجود افراد بھی اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے صنف نازک کو نشانہ بناتے تھے مثلاً یہ منظر دیکھیے کہ جب قافلہ کسی جگہ پڑاؤ کرتا تو لوگ کچھ نہ کچھ کھانے کا اہتمام کرتے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہوتا:

> جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرتے جب اندھیرے میں چوری کی جا سکتی تھی یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کر کے، کہ حیوانی جذبے اور ان کے پالنے والے ہر حالت میں زندہ رہتے ہیں، معاوضے میں اشیائے خوردنی حاصل کی جا سکتی تھیں۔[۱۹]

نعیم اس مسافر قافلے میں بلوائیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ درحقیقت ناول نعیم کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات ناول کی اثر انگیزی کو بڑھانے کے بجائے کم کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ گو کہ ناول نگار نے کچھ واقعات کے ذریعے انسانی نفسیات میں انتقام کے عنصر کو ابھارنا چاہا ہے اور یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ روشن پور کے مکین اب روشن منزل کے مکین ہیں۔ محض زمینی ہجرت نے ان کے مقام و مرتبہ کو گزند نہیں پہنچائی جبکہ دیگر لاکھوں لوگ

جو پہلے بھی استحصال کا شکار تھے آج بھی نا پرسان حال ہیں۔ تمام کرداروں کے عمومی انجام سے قاری کو روشناس کرانے میں مصنف نے ناول کے فطری بہاؤ کو گہنا دیا ہے۔

ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر محسوس ہوتا ہے اور وہ آئیت کریمہ ہے جو ناول کے حصے ''بٹوارہ'' کے آغاز میں دی گئی ہے۔

واذاقیل لھم لا تفسدو افی الارض قالو انما نحن مصلحون (۱۱:۲)

(جب ان سے کہا گیا کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان والوں میں سے ہیں)[۲۰]

یہاں مصنف سے ترجمے میں سہو ہوا اور حیرانی کا باعث یہ امر بھی ہے کہ ناقدین ادب کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا۔جبکہ آئیت کا آخری لفظ جس کا ترجمہ مصنف نے '' ایمان والے'' کیا ہے ''مصلحون'' ہے۔''مصلحون'' عام فہم لفظ ہے اور اس کے معنی '' اصلاح کرنے والے'' کے ہیں۔ اگر خود آیت کے مفہوم میں بھی دیکھا جائے تو ''ایمان والوں میں سے'' کی گنجائش نظر نہیں آتی کیونکہ زمین پر فساد پھیلانے والوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے اور فساد پھیلانے والوں کا کہنا ہے کہ ہم دراصل ''اصلاح کرنے والوں میں سے'' ہیں۔ گویا دراصل ہم فساد نہیں پھیلا رہے جبکہ حقیقتاً وہ فساد پھیلا رہے ہوتے ہیں۔

عبداللہ حسین کے دیگر ناول بھی اہم ہیں اور ان کے پس منظر میں بھی مشترکہ ہندوستان ابھرتا ہے لیکن ''اداس نسلیں'' کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں بطور خاص ہندوستان کے سیاسی ذہن کو موضوع بنایا گیا ہے اور ہندوستان کے عام نچلے طبقات کس طرح استحصال کا شکار ہوتے رہے ہیں اور بٹوارے کے عمل میں انسانی بربریت کے مظاہرے کیونکر ہوئے ناول نگار نے اس عمل کو بڑے کینوس پر منتقل کیا ہے۔

قرۃالعین ہندوستانی تاریخ کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے ہندوستان کی صدیوں پر محیط تہذیب کو پیش نظر رکھتی ہیں بلکہ اسے مرکزہ بناتی ہیں اور تقسیم کو دراصل اس تہذیبی المیے کے طور پر دیکھتی ہیں جو صدیوں پر محیط عمل میں فروغ پائی تھی۔ جبکہ خدیجہ مستور تقسیم کو سیاسی عمل سمجھتی ہیں۔''آنگن'' سامراج کی تقسیم کرو اور حکومت کرو'' جیسی سیاسی پالیسی کے پس منظر کے ساتھ ماجرا کو بیان کرتا ہے۔ یعنی جب دو مذاہب کے درمیان سیاسی مسابقت نے جنم لے لیا اور سیاسی و سماجی اعتبار سے بداعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی تو تقسیم اس کا لازمی نتیجہ تھی۔ البتہ ''آنگن'' کی خدیجہ مستور ہوں یا ''آگ کا دریا'' کی قرۃ العین دونوں فسادات کے بہیمانہ عمل کو صفحہ قرطاس پر منتقل نہیں کر سکیں۔ عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' میں فسادات کا موضوع براہ راست اختیار نہیں کیا گیا بلکہ مصنف نے ہندوستان کی قریباً 90 سالہ تاریخ اس ترتیب سے بیان کی ہے کہ فسادات اس ماجرے کا لازمی جزو بن کر سامنے آتے ہیں۔ فسادات اور ہجرت برصغیر کی تاریخ میں بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ اس المیے پر "War and Peace" جیسا ناول ابھی اپنے تخلیق کار کی تلاش میں ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

یوں لگتا ہے کہ تحریک آزادی اور فسادات کے حوالے سے ہمارا ناول ابھی تک ''مزید کچھ اور'' کی تلاش میں

ہے۔اس لیے کہ سقوط ڈھاکہ نے بھی اس موضوع کو مزید وسعت اور گہرائی عطا کر دی ہے۔[۲۱]

فسادات اور تقسیم کو دیگر ناول نگاروں نے بھی موضوع بنایا ہے لیکن یا تو ان کا ذکر سرسری ہے یا وہ ماجرا کے پس منظر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔اس لیے عصریت کا عنصر ان ناولوں میں کم ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، ص ۹۵

۲۔ ادارہ، بیسویں صدی کے نصف آخر میں افسانوی ادب، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، مدیر عمومی: خواجہ محمد زکریا، پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۲ء ص ۵۴۱

۳۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۰، ص ۱۱۵

۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، مشمولہ: مجموعہ عبداللہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۷

۵۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، ملتان، طبع اول، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۸

۶۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۲

۷۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین: شخصیت اور فن (کتابی سلسلہ: پاکستانی ادب کے معمار)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۴۱

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری ۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، پہلی بار، ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۴

۹۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، ص ۱۲۳

۱۰۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، مشمولہ: مجموعہ عبداللہ حسین، ص ۴۴۸۔۴۴۷

۱۱۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، ص ۱۲۰

۱۲۔ مشتاق احمد دانی، ڈاکٹر، تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۴

۱۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، ص ۲۰۷

۱۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۴۵۰

۱۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۴۵۴

۱۶۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۴۵۴

۱۷۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۴۵۸

۱۸۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں،ص۴۶۲

۱۹۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں،ص۲۶۵

۲۰۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں،ص۳۹۵

۲۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، ماجرا سرائے پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول، ۲۰۰۸ء،ص۱۵۴